دور حاضر کا انسان

آیت اللہ بہشتی و شہید جواد باہنر
ترجمہ: رضا عباس

زندگی کی سہولیات کی فراہمی کے نقطۂ نظر سے دور حاضر کا انسان آج ایک پر شکوہ مقام پر فائز ہے۔ لاتعداد دریافتوں اور سائنسی اختراعات نے اس کی زندگی میں اتنے امکانات پیدا کر دیے ہیں کہ جن کے بارے میں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

برقی آلات اور الیکٹرانک مشینوں نے کتنے ہی مشکل کاموں کو اس کے لئے اتنا آسان کر دیا ہے کہ صرف ایک بٹن دبانے سے اسے ساری سہولیات مہیا ہو جاتی ہیں۔ ریڈیو لہریں چشم زدن میں اس کی آواز اور تصویر دنیا کے دور دراز مقامات تک پہنچانے کو تیار رہتی ہیں۔ ہوائی جہاز کے ذریعہ ہم دنیا کے ایک کونے سے دور دوسرے کونے تک برق رفتاری کے ساتھ سفر کرنے پر قادر ہیں، جس سے زیادہ رفتار ہمیں صرف دیومالائی کہانیوں میں ہی سننے کو ملتی ہے۔ خلائی ماہرین نے آسمان میں بھی اپنے پیر پھیلا لیئے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک خلائی کرے سے دوسرے کرے تک جانا ایک شہر سے دوسرے شہر کے سفر جیسا آسان ہو گیا ہے۔ اگر آج ہم روز بروز ہو رہی نئی دریافتوں کا شمار کرنا چاہیں تو شاید یہ ناممکن ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فطرت نے ان تمام رازھائے سربستہ کو جنھیں اس نے اپنے بطن میں چھپا رکھا تھا، یک لخت انسان کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔ فطرت کے رازوں کی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے آج انسان نے فطرت کو مسخر کر لیا ہے اور ترقی کے بام عروج پر پہنچ گیا ہے۔ اس کا معیار زندگی کئی گنا اونچا اٹھ گیا ہے اور وہ ایک پر شکوہ زندگی جی رہا ہے۔

حیوان حریص:

اب تک ہم نے جو کچھ کہا وہ سکے کا صرف ایک رخ ہے۔ اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس مادہ پرست تہذیب نے جہاں فطرت کے رازوں کی گتھیاں سلجھا کر اسے فطرت کے مقابلے میں قوی و طاقتور بنایا ہے، وہیں دوسری طرف اسی مادی سوچ اور فلسفے کی تبلیغ کے نتیجے میں وہ لالچ کا پتلا بن گیا ہے۔ آج کا انسان عیش و سہولت کا غلام بن کر دن رات اسی کو پانے اور بڑھانے میں لگا ہوا ہے۔ آج انسان میں لالچ اور مادہ پرستی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اس کا پورا وجود پیداوار اور صارفیت کی ایک مشین بن گیا ہے۔ دور حاضر کے انسان میں اقتصاد کی اہمیت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اس کے وجود کے باقی تمام پہلو ختم سے ہو گئے ہیں۔ وہ انسان جو کبھی آزادی میں ہی سکون و اطمینان محسوس کرتا تھا اور اس کے حصول کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دینے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتا تھا، آج خود اپنی مرضی سے خود کو عیش و نوش اور اوزار تولید کی زنجیروں میں قید کر رہا ہے۔

جیسے جیسے انسان اس مادہ پرست ترقی کے راستے پر آگے بڑھ رہا ہے اس کی ضرورتیں بھی بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ بھی مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ حالات یہ ہو گئے ہیں کہ اس مادہ پرست سماج میں سبھی بلند انسانی اقدار دھیرے دھیرے ختم سے ہو گئے ہیں اور اخلاق بھی صرف ماڈی نظریئے سے ہی اپنایا جا رہا ہے۔ دنیا کے بیشتر حصوں میں تعلیم و تربیت کا ڈھانچہ بھی اقتصادی بنیادوں پر تعمیر ہے۔ آج کسی بھی تعلیمی ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد ایسے افراد پیدا کرنا ہے جو اپنی یا کسی ادارے کی جیب زیادہ سے زیادہ مقدار میں بھر سکیں۔ آج سماج کے سبھی طبقوں کا ایک ہی نعرہ ہے "دولت کماؤ اور عیش کرو" اس نعرے سے سیاستداں، صاحب فہم، ماہرین فن، مصنف، اور آرٹسٹ کوئی بھی اچھوتا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جو حضرات مذہبی اور روحانی کاموں سے جڑے تھے وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آج بیشتر مشینری کام بھی اقتصادی فائدے اور معاوضے کے بل پر انجام پاتے ہیں۔ یہ حالات چاروں طرف پھیلے ہوئے مادی فلسفے کا ہی نتیجہ ہیں۔

آج ہر انسان کو یہ بات رٹائی جا رہی ہے کہ انسان صرف ایک اقتصادی حیوان ہے اور اس کی

سعادت اور ترقی اسی بات میں مضمر ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مال و دولت کمائے۔ لوگوں کے کانوں میں چاروں طرف سے آج یہ انڈیلا جا رہا ہے کہ دولت میں ایک معجزاتی طاقت ہے اور یہ دنیا جہاں کے مسائل کو چٹکی بجاتے میں حل کر سکتی ہے۔ آج چاروں طرف اناپ شناپ دولت کمانے اور اس کے ذریعے اپنی خواہشات نفسانی کی ہی بات چل رہی ہے۔ ان حالات میں انسان بلکہ نیم انسان کا "حیوان حریص" بن جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اسے ہر وقت یہی فکر ہے کہ کس طرح جائز یا ناجائز طور پر مال کمایا جائے اور عیش و نوش میں خرچ کیا جائے۔ دور حاضر کا انسان پیداوار اور استعمال کا غلام بن چکا ہے۔ اس کی زندگی تمام اعلیٰ اخلاقی اور معاشرتی اقدار سے یکسر خالی ہے۔ آج اس کی زندگی میں بیہودگی اور بے معنویت کا ہی بول بالا ہے۔

فلسفہ حیات اور ہدف زندگی کی تلاش:

یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ اس پیداوار اور مصرف کی اس دنیا میں کچھ نئی آوازیں بھی سنائی دینے لگی ہیں۔ جن کے ذریعے یہ امید بندھی ہے کہ شاید اب انسان اقتصادی بیڑیوں سے آزادی حاصل کر لے۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ آوازیں ادھیڑ یا بڑی عمر کو پہنچے لوگوں کی نہیں بلکہ جوانوں کی ہیں۔ گزشتہ کچھ زمانے سے نوجوانوں کی جانب سے یہ باتیں آ رہی ہیں کہ ہم ان سجے سجائے پر شکوہ اور شاندار محلوں میں بھی زندگی کو بے معنی و مصرف پاتے ہیں۔ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان پر شکوہ اور سجے سجائے محلوں میں خوشی اور خوشبختی کہاں ہے؟ کیا یہ کشتئ حیات جو سامان سفر اور اسباب تعیش سے لیس ہے، کبھی امن و آشتی کے ساحل سے ہمکنار ہوگی؟ کیا یہ پر شکوہ تمدن خود ان کے لئے بھی کسی اہمیت کا حامل ہے؟ کیا زندگی کو آسان بنانے والے تمام وسائل واقعاً انسان کی خدمت کر رہے ہیں یا انہیں حالات نے انسان کی تمام تر جسمانی اور دماغی صلاحیتوں کو خود اپنا غلام بنالیا ہے؟

کیا شہروں اور آسمانی کروں کے درمیان فاصلوں کو ختم کرنے والے اور دنیا کو ایک محلے یا گھر میں تبدیل کرنے والے اس عظیم الشان تمدن نے اس دنیا میں رہنے والے لوگوں کے دلوں کے بیچ کی دوریاں بھی ختم کر دی ہیں؟ یا یہ کہ جسمانی طور پر نزدیک ہونے کے باوجود لوگوں کے دلوں کے درمیان

فاصلے بڑھ گئے ہیں۔یا شاید یہ کہ لوگوں کے پاس اب دل ہی نہیں رہ گئے ہیں۔ان کے پاس صرف دماغ اور ہاتھ ہیں جو ہر لحہ شکم اور زیر شکم خواہشات کو پورا کرنے کے لئے تیار ہیں۔انہیں شان و شوکت اور جاہ طلبی کے سوااب کچھ نظر نہیں آتا۔

یہ بات سچ ہے کہ ایسی باتیں انہیں افراد کی طرف سے سامنے آتی ہیں جو اقتصادی طور پر ترقی یافتہ ممالک سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں بنیادی ضروریات زندگی کی فکر لاحق نہیں ہے۔یہ بھی سچ ہے کہ دنیا کے بیشتر علاقوں میں اب بھی کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو غربت اور افلاس کے مارے ہیں۔ ان کے اہل عیال، لواحقین اور پڑوسی سب ایک بدتر زندگی جینے پر مجبور ہیں۔اب انہیں یہی ایک امید ہے کہ کوئی خونین انقلاب رونما ہو اور ان کے تمام مادی اور اقتصادی مسائل کا خاتمہ کردے۔لیکن صحیح پیش بینی اس کی متقاضی ہے کہ ان مصیبت زدہ افراد کی کاوشیں اس سمت پر موڑ دی جائیں کہ انہیں اس انجام کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

بہر حال یہ ایک امر مسلم ہے کہ لوگ بیدار ہو گئے ہیں اور مادی اور اقتصادی ترقی کے جنون سے چھٹکارا پارہے ہیں۔دور جدید کی دونوں بڑی تہذیبیں آج دیکھ رہی ہیں کہ:

”ہر چند کہ انسان صدیوں سے اپنی زندگی کو بہتر اور آسان تر بنانے کے لئے کوشش کرتا رہا ہے سرمایہ داری اور اشتراکی دونوں تہذیبوں میں آج انسانوں کو بے رحمی کے ساتھ صنعتی قربانگاہوں کی بھینٹ چڑھایا جارہا ہے ۔ دونوں تہذیبوں میں ”انسانی حقوق“، ”انسانی تقدس“ اور ”انسانی آزادی“ جیسے الفاظ صرف کھوکھلے نعرے بن کر رہ گئے ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔دونوں نظاموں نے انسان کی عزت نفس کو اس بہانے سے پامال کردیا ہے۔ جدید صنعتی پہیئے کی پیچیدہ گردش کا یہی تقاضہ ہے۔

بہر کیف دور حاضر کا انسان اب اس بات کے لئے تیار نہیں ہے کہ وہ ذرائع صنعت اور ٹیکنالوجی سے طرز زندگی کا سبق سیکھے۔اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ یہ جان لے کہ اس کا اصل ہدف زندگی کیا ہے؟

قنوطیت پسندوں کی رائے کے برعکس یہ آوازیں جو کبھی زمزمہ اور کبھی فریاد کی صورت میں

ہمارے کانوں سے ٹکراتی ہیں، انسانیت کے لئے ایک خوش آئند اور پر برکت مستقبل کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں۔ ان کے توسل سے انسانیت کی سوئی ہوئی حس بیدار ہو سکتی ہے اور انسان کو اس بات سے آگاہ کر سکتی ہے کہ وہ مشینی ترقی کو انسانیت کی ترقی نہ سمجھے اور اپنے مقصد حیات کو فکر و تحقیق کے ذریعہ حاصل کرنے کی راہ میں کوشش کرے۔ مزید بر آں یہی آوازیں انسانیت کو سعادت اور خوش بختی کے ساحل کی نشاندھی بھی کر سکتی ہیں۔

قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

قرآن کے مطابق زندگی کی چمک دمک اور شان و شوکت انسان کے ''ہدف زندگی'' ایمان اور روحانیت کے بغیر بے معنی ہیں۔ اور ایسی زندگی گزارنے والے لوگ دراصل خسارے میں ہیں۔ ارشاد خداوند تعالیٰ ہے:

''جان لو کہ دنیاوی زندگی محض کھیل تماشا اور ظاہری زینت اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ خواہشات ہے۔ اس کی مثال تو بارش کی سی ہے جس کی وجہ سے کسانوں کی کھیتی (لہلہاتی اور) انہیں خوش کر دیتی ہے پھر سوکھ جاتی ہے۔ تو تو اس کو دیکھتا ہے کہ زرد ہو جاتی ہے پھر چور چور ہو جاتی ہے۔''(سورہ حدید: ۲۰)

ایک دوسرے مقام پر اللہ تبارک تعالیٰ کو ''زمین و آسمان کا نور'' کہا گیا ہے۔ وہی حق جو عالمین کے لئے روح اور منزل مقصود کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد اس بلند پایہ اور باہوش شخص کا ذکر آتا ہے جس کی تلاش معاش اور زندگی کی جدو جہد اسے یاد خدا سے غافل نہیں کرتی۔ اس کا کوئی بھی شغل اسے اس کے اصل مقصد حیات سے منحرف نہیں کرتا۔ دراصل ایسے لوگ ہی بہترین نتائج حاصل کرتے ہیں۔ انہیں کے اعمال اور کاوشیں بار آور ہوتی ہیں اور یہی لوگ صاحب فضل و کمال ہوتے ہیں۔ قرآن ان لوگوں کے انجام کو بھی بیان کرتا ہے جو اپنے ہدف زندگی سے بے خبر اور یاد خدا سے غافل ہیں:

''اور کفر کرنے والوں کی کارستانیاں ایک سراب کے مانند ہیں کہ پیاسا اس کو دور سے تو پانی خیال کرتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس آیا تو اس کو کچھ بھی نہ پایا اور خدا کو اپنے پاس موجود پایا تو

اس نے اس کا حساب پورا پورا چکا دیا اور خدا تو بہت جلد حساب کرنے والا ہے یا پھر کافروں (کے اعمال کی) مثال اس بڑے گہرے دریا کی تاریکیوں کی سی ہے جیسے ایک لہر اس کے اوپر ابر ڈھانکے ہوئے ہے۔ غرض تاریکیاں ہیں کہ ایک کے اوپر ایک اُمڈی چلی آتی ہیں، اس طرح کہ اگر کوئی شخص اپنا ہاتھ نکالے تو اسے دیکھ نہ سکے۔ اور جسے خدا ہی نے ہدایت کی روشنی نہ دی ہو تو اس کے لئے کہیں کوئی روشنی نہیں"

(سورہ ۲۴: آیہ ۳۹۔۴۰)

ان آیات پر غور کیجیے اس میں وہی حقیقت بیان کی گئی ہے جو آج کے عظیم ترقی یافتہ تمدن میں زیادہ واضح نظر آتی ہے۔ صرف مادی زندگی ایک سراب کے مانند ہے۔ ایک حریص انسان کی جدوجہد جو مقصد و ہدف زندگی سے ناآشنا ہے، اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اس کے لئے ہر جانب تاریکی ہی تاریکی ہے، جس میں وہ اپنے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

آخر کار وہ سوال پھر باقی رہتا ہے کہ زندگی کا مقصد اور ہدف کیا ہے؟

قرآن کے مطابق اس بے ہدفی اور تاریکی کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان دولت ایمان سے محروم ہے اور وہ اپنی تمام تر توجہات مادی تقاضوں پر لگائے ہوئے ہے۔ وہ "پیداوار برائے مصرف اور مصرف برائے پیداوار" کے چکر میں الجھا ہوا ہے۔ ایسے لوگ ممکن ہے کہ مادی ترقی اور حصول دنیا میں آخری حد کو پہنچ جائیں، مگر دراصل ایسے لوگ جوہر انسانیت اور ارزش انسانی سے محروم رہتے ہیں۔

قرآن کا ارشاد ہے:

"جو شخص دنیا کی زندگی اور اس کی رونق کا طالب ہو تو ہم انہیں ان کی کارگزاریوں کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پورا بھر دیتے ہیں اور یہ لوگ دنیا میں گھاٹے میں نہیں رہیں گے، مگر یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور جو کچھ ان لوگوں نے کیا دھرا تھا سب اکارت ہو گیا اور جو کچھ یہ لوگ کرتے تھے سب ملیامیٹ ہو گیا" (ہود: ۱۴، ۱۵)

ایمان اور شک:

اگر ہم کسی شخص کے اس حد تک معتقد ہوں کہ اس پر اعتماد کر سکیں تو ہم کہتے ہیں کہ اس

شخص پر ہمیں 'ایمان ہے۔ اسی طرح اگر ہم کسی نظریہ کے یقین کی حد تک قائل ہوں تو ہم کہتے ہیں کہ ہمیں اس پر ایمان ہے۔ جب ہم ایک فکری نظرئے یا آئیڈیولوجی پر یقین رکھتے ہیں اور اس کی جانب ایک ایسا لگاؤ اور رغبت محسوس کرتے ہیں کہ اسے بہ رضا و خوشی اور اطمینان قلب کے ساتھ اپنی حیات کا محور قرار دیں تو ہم کہتے ہیں کہ ہم اس مسلک پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان مثالوں کے ذریعہ یہ بات واضح ہے کہ ایمان کسی شخص، کسی نظریہ، کسی مسلک یا کسی دین پر مکمل یقین اور اطمینان قلب کا نام ہے۔

شک و شبہ یا انکار و تزلزل ایمان کی ضد ہیں، خواہ یہ شک کسی انسان کے لئے ہو، کسی نظریے کے لئے ہو یا کسی مسلک کے لئے۔ کسی بھی شک اور تزلزل کا نتیجہ بے اعتمادی ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ شک و تزلزل کے ساتھ چاہے وہ امید کے ساتھ ہی ہو، کسی شخص یا مسلک پر مکمل واعتماد کیا جاسکے، خصوصاً ان معاملات میں جہاں اس اعتماد کے سبب کسی یقینی یا ممکن خطرے کے روبرو ہونے کا احتمال ہو۔

اب ہم یہ غور کریں گے کہ آج ہماری زندگی میں "ایمان" کی کیا اہمیت ہے؟

ایک بچے کی زندگی پوری طرح ایمان کے محور پر گردش کرتی ہے یعنی اسے اپنے اطراف، اپنے ماں باپ، اپنے بھائی بہن اور اپنے مربی پر کامل ایمان ہوتا ہے۔

ایک بچے کی بہتر نشو نما کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے باپ، معلم اور مربی یا جو کوئی بھی اس کی زندگی سے وابستہ ہے، اس پر مکمل اعتبار اور ایمان رکھے۔ وہی لوگ اس اہم فرض کو نبھا سکتے ہیں جو اپنی ذمہ داریوں کے تئیں ایمان رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ماں جو انتہائی محبت و ایثار کے ساتھ اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے، اور وہ باپ اور معلم جو اس بچے کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو بخیر وخوبی انجام دیتے ہیں، یہ سب اس بچے کے خوش آیند مستقبل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

عہد طفلی جب بلوغ کی حدوں تک پہنچنے لگتا ہے تو انسان کی روح و جسم میں کئی قسم کے بدلاؤ رونما ہوتے ہیں۔ منجملہ تبدیلیوں میں ایک تبدیلی یہ بھی ہوتی ہے کہ ان نظریات کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس پر پہلے وہ ایمان رکھتا تھا۔ اس شک و تردید کا دائرہ فرداً فرداً مختلف ہوتا ہے۔ کچھ لوگ وہ بھی ہوتے ہیں جو تقریباً سبھی امور میں شک و شبہ میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

دوران بلوغ کا شک تعمیری شک ہے اور انسان کے ارتقاء اور تکامل کے لئے نہایت موثر

ثابت ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ شک سنجیدگی، جستجو اور روحِ تحقیق کے ساتھ کیا جائے۔ صرف یہی شک تعمیری شک کہلانے کے قابل ہے، حالانکہ شک کا مقصد ہی یہ ہے کہ تمام ان نظریات کی جنہیں ہم اب تک مانتے آئے ہیں، تردید کی جائے اور تحقیق و جستجو جو تعمیر سے متعلق ہے اس تردید کے بعد رونما ہوتی ہے مگر چونکہ یہ تعمیر انہدام کے بعد وجود میں آتی ہے، اس لئے ہم ان شکوک کو تعمیری کہیں گے۔

دورانِ بلوغ کا شک معمولاً انسان کو تحقیق اور جستجو پر آمادہ کرتا ہے۔ عمر کے اس موڑ پر وہ ان تمام باتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے، جو اسے بچپنے میں سکھائی گئی تھیں اور دوسرے تمام شعبہ ہائے زندگی کی طرح اس شعبۂ زندگی میں بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہے تاکہ وہ یہ ثابت کرسکے کہ وہ اب بچہ نہیں رہا۔ گویا کہ یہ شک بھی ایک ایمان کے ہمراہ ہوتا ہے۔ یعنی خود پر ایمان، اپنی صلاحیتوں پر ایمان، اس کے علاوہ اس بات پر ایمان کہ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا کچھ اپنے آپ سمجھ سکتا ہے؟ دورانِ بلوغ کے شک کے دوران انسان اپنے سامنے عجائبات اور مجہولات سے بھری ہوئی ایک نئی دنیا پاتا ہے۔ اس وقت اس کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اپنی تحقیقی صلاحیتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے کد و کاوش کے ذریعہ اس کی زیادہ سے زیادہ معرفت حاصل کرے۔

اگر دورانِ بلوغ کا شک مثبت تحقیق کے ہمراہ نہ ہو تو اسے تعمیری شک کہنا غلط ہوگا۔ اس صورت میں انسان کا اعتماد ہر شئے پر متزلزل ہو جاتا ہے اور وہ ایک دماغی کرب و عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے دورانِ بلوغ کے بعد کا ایمان اس کی زندگی میں بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔

علم و صنعت کی پیشرفت میں ایمان کا کردار:

علم و صنعت کی تمام ترقیاں جو آج کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں، انسان کی سخت ترین کد و کاوش اور تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ کسی ایک دریافت کے لئے کبھی کبھی سائنس دانوں کو سیکڑوں اور ہزاروں ٹیسٹ اور تجربات کرنے پڑتے ہیں، اکثر انہیں کسی ایک نظریہ کو ثابت یا رد کرنے کے لئے ہزاروں مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس لگن اور ایمان کے ساتھ وہ اپنی جستجو اور تحقیق کو انجام دیتے ہیں، وہ بے مثال ہے۔ شاید آپ نے بھی اپنے اندر ایمان کی اس لذت کو محسوس کیا ہو!

آئین اور مسلک پر ایمان:

جب انسان عہد طفلی کے حدود کو پار کرتے ہوئے رشد اور بلوغ کی منزلوں میں پہنچتا ہے یعنی جب وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا ہے تو اس وقت وہ اپنی زندگی کا ایک ہدف قرار دیتا ہے۔ اور اس ہدف کو حاصل کرنے کی راہ میں قدم بڑھانا چاہتا ہے۔ زندگی کے اس حساس ترین مرحلے یعنی ہدف و راہ کے انتخاب یا باالفاظ دیگر آئین و مسلک کے انتخاب میں اس بات کی ضرورت ہے کہ پہلے اس آئین و مسلک کے بارے میں اطمینان آور اور یقین آور معرفت حاصل کی جائے تاکہ زندگی کے تمام نشیب و فراز میں وہ عزم و آگاہی کے ساتھ تکامل کی جانب پیشرفت کر سکے اور تمام حالات میں با رضا و خوشی زندگی گزارے۔

بے لگام آزادی کسی مسلک کے مطابق نہیں:

ایمان کے ساتھ یقیناً کچھ پابندیاں بھی عاید ہوتی ہیں۔ انسانی معاشرے میں ہر مسلک یا آئیڈیو لوجی کے کچھ اصول و قوانین ہوتے ہیں، جنہیں تسلیم کرنا ان کے معتقدین کے لئے لازمی اور ضروری ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو بے مسلک اور آزاد کہتے ہیں کسی نہ کسی سماجی نظام یا قانون کو ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ گروہ جو رائج الوقت نظام سے بغاوت کر کے اپنے علیحدہ کلب وغیرہ بناتے ہیں، وہ بھی اپنے گروہ کے لئے کسی نہ کسی اصول کے قائل ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بے مسلکی میں تو انسان پر ذمہ داریاں عاید ہوں اور ایک تعمیری نظریہ اور آئڈولوجی کے تحت اس پر کوئی اخلاقی اور سماجی ذمہ داری عائد نہ ہو؟ ہمارے معاشرے کے آزاد خیال افراد کو سمجھ لینا چاہئے کہ اصول و قوانین سے فرار نہ تو فطری ہے اور نہ ہی آزاد خیالی کا تقاضہ۔

ایمان با آگاہی:

عہد طفلی کا ایمان اپنی پاکیزگی اور سادگی کے باوجود ان معنوں میں نامکمل ہے کہ یہ آگاہی اور تجزیہ کے بغیر حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایمان چونکہ ناآگاہانہ طور پر اپنے ماحول کی مطابقت سے پیدا ہوتا ہے اسی

لیے عہد بلوغ کے شکوک اور شبہات کا سامنا نہیں کر سکتا اور متزلزل ہو جاتا ہے۔

عہد طفلی میں اس سادے ایمان سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی، لیکن عہد بلوغ میں یقیناً آگاہی تجزیہ و تحلیل کے ساتھ اسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی تعلیم کے اعلیٰ ترین منبع یعنی قرآن کریم کی آیات ہم کو تفکر اور تدبر اور تجزیہ و تحلیل کے ساتھ ایمان حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

☆☆☆☆